رسائل و مسائل

معاشی مسائل سے متعلق چند عملی سوالات و جوابات

(عدالتی بیانات کو چھوڑ کر "ترجمان" ایک عرصے سے مولانا مودودی کے قلمی افادات سے محروم ہے، ناظرین اس کمی کو شدت سے محسوس کرتے ہوں گے۔ نومبر ۵۲ء میں مولانا محترم نے کراچی میں تجار کے ایک اجتماع کو خطاب کیا تھا۔ اصل تقریر تو غالباً نوٹ نہیں کی جا سکی، لیکن تقریر کے آخر میں جو سوالات کیے گئے اور ان کے جو جوابات دیے گئے تھے وہ سامعین میں سے ایک صاحب نے نوٹ کر لیے تھے۔ حال ہی میں خوش قسمتی سے دفتر کے کاغذات میں ہمیں یہ سوالات و جوابات مل گئے ہیں۔ مولانا سے ان کی تصحیح و تنقیح کرانا اس وقت ممکن نہیں تھا، اس لیے افادیت کے پیش نظر انہیں اسی حالت میں شائع کیا جا رہا ہے۔ بیشتر سوالات اقتصادی موضوع سے ہی متعلق ہیں۔ ایک آدھ سوال عمومی نوعیت کا بھی ہے۔)

س۔ موجودہ زمانہ میں، جبکہ تجارتی کاروبار بلکہ پوری معاشی زندگی سود کے بل پر چل رہی ہے اور اس کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس میں سود رچ بس نہ گیا ہو، کیا سود کا استیصال عملاً ممکن ہے؟ کیا سود کو ختم کر کے غیر سودی بنیادوں پر معاشی تعمیر ہو سکتی ہے؟

ج۔ اگر کوئی مسلمان یہ سمجھتا ہے کہ سود ایک ناگزیر شے ہے اور موجودہ زمانے میں اس کے بغیر کوئی کام ہی نہیں چل سکتا، تو میرے نزدیک اس کا یہ خیال باطل ہے۔ یہ خیال نہ صرف اصولاً غلط ہے بلکہ یہ اُس خدا کے بارے میں سوءِ ظن ہے جس کے بارے میں ہمارا ایمان ہے کہ اُس نے کسی ایسی چیز سے ہمیں نہیں روکا ہے جو انسانی زندگی کے لیے ناگزیر ہو اور جس کے بغیر دنیوی کاروبار چل ہی نہ سکتا ہو۔ لیکن میں صرف اتنا ہی جواب دینے پر اکتفا نہیں کروں گا بلکہ یہ عرض کروں گا کہ خود موجودہ دور میں معاشیاتی اصول و نظریات بھی اس طرف جا رہے ہیں کہ سود کی شرح کو کم سے کم حتیٰ کہ صفر کی حد تک پہنچا کر اسے ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اکثر ممالک میں شرح سود تیز رفتاری سے گر رہی ہے اور دنیا اس

مقام کے قریب تر پہنچنے کی کوشش کر رہی ہے جہاں سود سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے مجھے یہاں اس بارے میں تفصیلی بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ میں اپنی کتاب "سود" میں اس موضوع پر مفصل تحریر کر چکا ہوں۔

البتہ میں یہاں مختصراً یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ایک اسلامی حکومت اس مسئلے کو عملاً کیسے حل کر سکتی ہے میرے نزدیک اس کا طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے ملک کے اندر سود کو بند کر دیا جائے۔ اس کے بعد دوسرے قدم کے طور پر بیرونی تجارت میں سود ختم کرنے کے لیے جدوجہد کی جائے۔ ملک کے اندر حکومت سودی لین دین کو قانوناً ناجائز قرار دے اور خود بھی سود کا لینا اور دینا ترک کر دے۔ کوئی عدالت سود کی ڈگری نہ دے۔ کوئی شخص اگر سودی کاروبار کرے تو اُسے فوجداری جرم کا مجرم گردانا جائے جب تک آغاز ہی میں ایسے فیصلہ کُن اقدامات نہیں کیے جائیں گے، اس امر کا سرے سے کوئی امکان ہی نہیں پیدا ہو سکے گا کہ کوئی ایسا مالیاتی نظام قائم ہو جو سود سے خالی ہو۔ اس حقیقت کو مثال سے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک حکومت اگر ایک طرف ریل کے سفر کے لیے ٹکٹ کو ضروری قرار دے دے اور دوسری طرف بغیر ٹکٹ کے سفر کے لیے بھی گنجائش باقی رہنے دے تو ٹکٹ لینے والے مسافر تھوڑے ہی نکلیں گے۔ لیکن اگر بلا ٹکٹ کا سفر فوجداری جرم ہو تو کوئی آدمی جو ٹکٹ نہیں لیتا ریل میں جانے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔ اسی طرح جب تک ہمارے ملک میں سود قانوناً حلال ہے، جب تک سودی لین دین کی اجازت ہے، جب تک ہماری حکومت خود سود لیتی اور دیتی ہے، جب تک ہماری عدالتیں سود کی ڈگریاں نافذ کرتی ہیں؛ اُس وقت تک اس بات کا کوئی قطعی امکان نہیں ہے کہ حکومت یا کوئی دوسرا ادارہ کوئی ایسا بینکنگ سسٹم چلانے میں کامیاب ہو جو سود خواری کے بجائے حصہ داری کے اصولوں پر قائم کیا گیا ہو۔ البتہ اگر سودی بنک کاری کو پہلے قانوناً حرام کر دیا جائے تو ہمیں پوری توقع ہے کہ حصہ داری کے اصول پر ایسا سسٹم نشوونما پا سکتا ہے۔ حصہ داری سے ہماری مراد یہ ہے کہ نفع و نقصان میں تمام حصہ دار برابر کے شریک ہوں۔ داخلی طور پر سودی بندش کے بعد خارجی لین دین میں بھی اس سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے ان شاء اللہ کسی لڑائی جھگڑے کی نوبت نہیں

آئے گی بلکہ دوستانہ طرز پر ثقافتی تعلقات قائم رکھتے ہوئے بھی دوسرے ممالک کو اس پر رضامند کیا جا سکتا ہے۔

س: اسلامی حکومت کی نیشنلائزیشن کے بارے میں کیا پالیسی ہونی چاہیے؟

ج: میں نے جہاں تک اس مسئلے کا اسلام کی روشنی میں مطالعہ کیا ہے، میں کہہ سکتا ہوں کہ اسلام ذرائع پیداوار کو قومی بنانے کے پروگرام کو بطور اصول کے اختیار نہیں کرتا۔ یہ چیز اسلام کے سارے اجتماعی نظام کے مزاج کے خلاف ہے۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے کسی ملک یا ریاست کے معاشی مسائل کا یہ صحیح حل نہیں ہے کہ سارے وسائل پیدائش کو قومی ملکیت بنا دیا جائے۔ البتہ کسی صنعتی یا تجارتی شعبے کے بارے میں اگر تجربے سے یہ معلوم ہو کہ اسے شخصی تحویل میں رکھ کر فروغ دینا ممکن ہی نہیں ہے یا اس طرح رکھنے سے ایسے مفاسد پیدا ہوتے ہیں کہ جن کا سد باب کسی دوسرے طریقے سے ممکن ہی نہیں ہے، تو ایسی صورت میں اسے ریاست کے کنٹرول میں لیا جا سکتا ہے۔

س: موجودہ ملازمین کی ایک بڑی تعداد میں بلندیٔ سیرت اور فرض شناسی کا جذبہ بہت ہی کم ہے، ایک اسلامی حکومت ان سے کیونکر کام لے گی؟

(ج) اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ حکومت کے ملازمین اور قوم کے بعض دوسرے افراد کی اخلاقی حالت نے پوری قومی زندگی کو بالکل کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے۔ یہ ایک بڑا نازک اور پیچیدہ مسئلہ ہے۔ میں اس کے حل کا طریقہ آپ کے سامنے مختصراً بیان کرتا ہوں۔ سب سے پہلے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اخلاقی جرائم لازمی طور پر خدا سے بے خوفی اور آخرت سے بے فکری کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ یہ تو خرابی کا بنیادی سبب ہے لیکن اس کے علاوہ اور بھی بہت سے اسباب ہیں جو ہماری معاشرتی زندگی میں پائے جاتے ہیں اور جن کی وجہ سے یہ خرابیاں چاروں طرف پھیل رہی ہیں۔ مثلاً ہمارے معاشرے کے اوپر کے طبقے نے نہایت ہی عیاشانہ اور مسرفانہ زندگی اختیار کر رکھی ہے۔ اس طبقے کی ضروریات صرف کھانے پینے، رہنے سہنے اور بچوں کی تعلیم کی حد تک محدود نہیں ہیں بلکہ انہیں ہزاروں روپے بعض دیگر مشاغل کے لیے درکار ہوتے ہیں۔ جو لوگ ملک کا نظام چلا رہے ہیں ان

کا تعلق بھی اسی طبقے سے ہے۔ قاعدے کی بات ہے کہ اوپر والوں کے عملی نمونے نیچے والوں کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ متوسط طبقہ اوپر والے طبقے کا اثر قبول کرتا ہے اور متوسط طبقے سے پھر ادنیٰ اور فروتر درجے کے لوگ اثر پذیر ہوتے ہیں۔ یہ متوسط اور بالکل نچلے طبقے کے لوگ تو ایک طرح سے اپنے آپ کو مجبور سمجھتے ہیں کہ وہ اپنا معیارِ زندگی قائم رکھنے کے لیے ہر طرح کے جائز و ناجائز ذرائع استعمال کریں۔

اب اگر آپ اس سارے مسئلے کو حل کرنا چاہتے ہیں تو آپ ہرگز یہ توقع نہ رکھیں کہ صرف ایک طبقے کی اصلاح سے اور وہ بھی قانون کے بل پر یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اس بیماری کی جڑیں معاشرے کی رگ رگ میں پھیل چکی ہیں۔ اسلام کا طریقہ یہ ہے کہ وہ معاشرتی خرابیوں کو رفع کرنے کے لیے صرف قوانین پر انحصار نہیں کرتا۔ بلکہ وہ خرابی پر ہر پہلو سے اور زندگی کے ہر شعبہ سے حملہ آور ہوتا ہے۔ وہ تعلیم و تربیت کے ذریعے سے، تبلیغ و تلقین کے ذریعے سے، اصلاح اور انسدادی تدابیر کے ذریعے سے اور ساتھ ہی قانون کے زور و اثر سے برائی کو مٹاتا ہے۔ ایک اسلامی حکومت کو معاشرے کی اصلاح کے لیے یہ سارے کام کرنا ہوں گے۔ تعلیم گاہوں، نشر گاہوں، اخبارات اور پراپیگنڈے کی ساری طاقتوں کو اس مقصد کے لیے استعمال کرنا ہوگا۔ پھر سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ عملاً اُن اسباب کو رفع کیا جائے جو اوپر والے طبقے کو اسراف پر آمادہ کرتے ہیں۔ اس طبقے کے جو لوگ اونچی ملازمتوں میں ہیں اُن کی تنخواہیں بڑھانے کے بجائے گھٹانے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ بیش قرار تنخواہیں ہی اُن کی فضول خرچیوں کا اصل باعث ہیں۔ نچلے درجے کے ملازمین کی تنخواہوں میں اضافے کی ضرورت ہے، کیونکہ بسا اوقات حقیقی ضروریات کی فراہمی ہی انہیں بدعنوانیوں پر مجبور کرتی ہے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ ادنیٰ اور اوسط درجے کے ملازمین کی کثیر تعداد یہ چاہتی ہے کہ وہ رشوت خوری اور دوسری ناجائز کارروائیاں نہ کرے لیکن بعض حالات میں وہ مجبور ہو جاتے ہیں۔ بہرحال اصلاحِ حال کے لیے یہ سارے اقدامات ناگزیر ہیں۔ ان سارے انتظامات کے باوجود جو لوگ رشوت اور خیانت سے باز نہ آئیں ایسے مجرمین کے لیے اس قسم کے قوانین ہونے چاہئیں جن کی رُو سے انہیں چوراہوں پر عبرتناک سزائیں دی جائیں۔

اس موقع پر بعض لوگ یہ سوال بھی اٹھاتے ہیں کہ اس طرح بجٹ میں دفعتہً اضافہ ہو جائے گا جس

اس کا جواب یہ دیتا ہوں کہ اگر ہمارے سرکاری اور نیم سرکاری ملازمین رائے کے سارے ایماندار بن جائیں اور ان کا احتیاج بھی باقی نہ رہے تو حکومت کی آمدنی بہت آسانی سے کم از کم دوگنی ہو سکتی ہے، کیونکہ رشوت، غبن اور خیانت کی وجہ سے حکومت کی بہت سی آمدنی تو خزانے تک پہنچنے ہی نہیں پاتی۔ اگر حکومت اس سے محروم نہ رہے تو وہ بسہولت تنخواہوں کے اضافے کو برداشت کر سکتی ہے۔ البتہ آغاز کار کے لیے حکومت کو شاید اس کی ضرورت پیش آئے گی کہ وہ پبلک سے بلا سودی قرضے طلب کرے لیکن حکومت کی ساکھ اور اس کا اعتماد اگر قوم میں موجود ہو تو ایک اصلاحی اسکیم کے لیے سود کے بغیر قرض حاصل کر لینا کچھ بھی دشوار نہیں ہے۔ اگر حکومت، ملازمین اور عوام دیانت داری کے ساتھ اس مہم میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں تو شاید چند سالوں کے اندر رشوت و خیانت کا نام و نشان بھی مٹ جائے اور جائز ذرائع کے ساتھ ہر شخص اپنی ضروریات مہیا کرنے کے قابل بھی ہو جائے۔

سوال۔ کیا اسلام کی رو سے پیشگی سودا بازی (FORWARD TRANSACTION) ناجائز ہے؟

جواب۔ یہ ایک لمبی بحث ہے لیکن اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ اسلام میں پیشگی سودے کی صرف ایک شکل جائز ہے اور اس کا نام بیع سَلَم ہے۔ بیع سلم میں چند شرائط کا پورا ہونا ضروری ہے:-

(۱) جس چیز کی خرید و فروخت ہو رہی ہو اس کا نام اور اس کی جنس کی نوعیت بالکل متعین ہونی چاہیے اور اس کا نمونہ بازار میں دستیاب ہونا چاہیے۔

(۲) لینے اور دینے والے کا تعین ہونا چاہیے۔

(۳) شے کی مقدار، قیمت اور شرح متعین ہونی چاہیے۔

(۴) اس وقت کا بھی تعین ہونا ضروری ہے جس وقت بائع مشتری کے سپرد مال کرے گا۔

(۵) پیشگی سودا کرتے وقت ساری قیمت کا ادا ہو جانا بھی لازمی ہے۔

اگر ان شرائط میں سے کوئی ایک شرط بھی پوری نہ ہوگی تو یہ بیع فاسد قرار پائے گی۔

سوال۔ غیر ملکی تاجر جب ہم سے سود نہ لینے پر مجبور ہو جائیں گے تو کیا وہ اپنے مال کی قیمتیں

نہیں بڑھا دیں گے؟ کیا اس طرح سے سودی لین دین کا بند کرنا عملاً بے سود نہ ہو جائے گا؟

جواب۔ اگر غیر ملکی تاجروں کی واجب الادا رقوم کی ادائیگی کا یقینی اور قابل اعتماد انتظام ہو جائے تو غالباً وہ اپنے مال کی قیمتیں نہیں بڑھائیں گے۔ لیکن بالفرض اگر قیمتوں میں کچھ اضافہ بھی ہو جائے تب بھی ہماری تجارت حرام کی آلائش سے تو محفوظ ہو جائے گی اور یہ درحقیقت خسارے کا نہیں بلکہ بڑے نفع کا سودا ہے۔ علاوہ ازیں ہماری معاشی زندگی میں اسلامی انقلاب دنیا بھر کے لیے سبق آموز ثابت ہوگا۔ ہماری عملی مثال سے انشاء اللہ تمام قومیں اس بات کی قائل بلکہ اس پر راضی ہو جائیں گی کہ سُود نہ جائز ہے اور نہ ناگزیر ہے۔

سوال۔ موجودہ بیرونی تجارت میں ایک عملی دقّت یہ بھی ہے کہ اس کے لیے بنک میں (LETTER OF CREDIT) کھولنا ضروری ہوتا ہے، اور بغیر سود کے اس کا کھلنا ممکن نہیں ہے۔

جواب۔ یہ صحیح ہے کہ موجودہ حالات میں افراد اگر دوسرے ممالک سے تجارت کرنا چاہیں تو ان کے رستے میں کچھ نہ کچھ مشکلات ہیں۔ لیکن یہ مشکلات اُسی وقت تک ہیں جس وقت تک ملک کی حکومت آپ کی پشت پناہی نہ کرے اور خود بھی اپنی خارجی تجارت میں سُود سے بچنے کی جدوجہد نہ کرے۔ لیکن اگر حکومت مختلف ممالک سے غیر سُودی بنیادوں پر معاہدے کرنے کی کوشش کرے، اپنے ملک کے اندر بھی غیر سودی مالی نظام قائم کرے اور بیرونی ممالک میں اپنے تاجروں کی ادائیگیوں میں بھی مدد دے تو تمام مشکلات کا حل بآسانی نکالا جا سکتا ہے۔

سوال۔ کیا ایک اسلامی حکومت غیر ملکی سرمائے کو سود پر ملک میں لگانے کی اجازت دے سکتی ہے؟ اجازت نہ دینے کی صورت میں ملک کی صنعتی ترقی رُک نہیں جائے گی؟

جواب۔ اسلامی حکومت میں کسی مسلم یا غیر مسلم، کسی ملکی یا غیر ملکی سرمایہ دار کو سودی کاروبار کی قطعاً اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اگر ملک میں سُود کو بند کر دیا جائے تو غیر ملکی سرمایہ خود بخود بھاگنا شروع کر دیگا۔ یہ چیز انشاء اللہ ہمارے حق میں مفید ہی ہوگی۔ ہمیں تاریخ میں کوئی مثال ایسی نہیں ملتی کہ کسی ملک نے غیر ملکی سرمائے کے بل پر ترقی کرنے کی کوشش کی ہو اور وہ الٹا مزید پھندوں میں مدت ہائے دراز تک نہ پھنس گیا ہو۔ ہمیں اپنے ملک ہی کے سرمائے سے تجارتی اور صنعتی نشوونما کی جدوجہد کرنی چاہیے۔

سوال۔ کیا اسلام میں زکوٰۃ وصول کرنے کے ساتھ ساتھ انکم ٹیکس عائد کرنا بھی جائز ہے؟

جواب۔ جی ہاں، اسلامی ریاست میں یہ دونوں چیزیں جائز ہو سکتی ہیں۔ زکوٰۃ کے مصارف بالکل متعین ہیں جو کہ سورۂ کہف میں بیان کر دیئے گئے ہیں۔ اسی طرح اس کا نصاب اور اس کی شرح بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین فرما دی ہے۔ ان امور میں کوئی ترمیم و تنسیخ جائز نہیں ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ریاست کو اگر دوسری مزید ضروریات درپیش ہوں تو ان کے لیے وہ قوم سے مالی مدد حاصل کر سکتی ہے۔ اگر یہ وصولی جبری ہو تو ٹیکس ہے، اگر رضاکارانہ ہو تو چندہ ہے، اور واپسی کی شرط ہو تو LOAN قرضہ ہے۔ زکوٰۃ اور یہ دوسری قسم کی وصولیاں نہ ایک دوسرے کی جگہ لے سکتی ہیں اور نہ ایک دوسرے کو ساقط کر سکتی ہیں۔ یہ تو اس مسئلے کا اصولی جواب ہے لیکن اس کے ساتھ ہی میں آپ کو یہ اطمینان بھی دلاتا ہوں کہ اگر ہمارے ملک میں ایک صحیح اسلامی حکومت قائم ہو جائے اور دیانت داری سے اس کا نظام چلایا جائے تو اتنے ٹیکسوں کی ضرورت باقی نہیں رہے گی جتنے آج موجود ہیں۔ موجودہ زمانے میں ٹیکسوں کے معاملے میں جتنی بدعنوانیاں اور بددیانتیاں ہوتی ہیں وہ آپ خوب جانتے ہیں۔ ایک طرف تو جس مقصد کے لیے ٹیکس لگایا جاتا ہے اُس کا مشکل دس فیصد اُس مقصد کے لیے صرف ہوتا ہے۔ دوسری طرف ٹیکس سے بچنے EVASION کی ایک عام ذہنیت پیدا ہو گئی ہے۔ اگر نظام درست ہو جائے تو موجودہ ٹیکسوں کا ایک چوتھائی حصہ بھی کفایت کرے گا اور افادیت چار پانچ گنا زیادہ ہو جائیگی

سوال۔ لوگوں میں یہ احساس عام ہے کہ اسلام کے اصول و احکام پسندیدہ اور مستحسن تو ہیں مگر بحالاتِ موجودہ قابلِ عمل نہیں ہیں۔ عوام و خواص میں اسلام سے جذباتی وابستگی تو ضرور ہے لیکن اسلام کا صحیح مفہوم اور آمادگیٔ عمل بہت کم ہے۔ اسلام جس ذہنی و عملی انضباط کا مطالبہ کرتا ہے اسے دیکھ کر یہ خدشہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسلامی قوانین کو نافذ کر دیا گیا تو کہیں اس کے خلاف شدید ردِ عمل نہ رونما ہو جائے۔ سیاسی انقلاب سے پہلے سماجی انقلاب ضروری ہے اور اصلاح کا جذبہ اوپر سے اور باہر سے پیدا کرنے کے بجائے اندر سے پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ صورتِ حال پیدا ہونے سے پہلے کیا اسلامی ریاست کا مطالبہ قبل از وقت نہیں ہے؟

جواب۔ اس سے متعلق اگر پوری وضاحت کی جائے تو اس کے لیے بڑے تفصیلی جواب کی ضرورت ہے لیکن میں اختصار کے ساتھ یہ عرض کروں گا کہ بلاشبہ سیاسی انقلاب سے پہلے ایک تمدنی، اجتماعی اور اخلاقی انقلاب کی ضرورت ہوتی ہے اور یہی اسلامی انقلاب کا فطری طریقہ ہے۔ بلاشبہ یہ بات بھی درست ہے کہ اسلام کے احکام و قوانین صرف اوپر سے ہی مسلط نہیں کیے جا سکتے بلکہ اندر سے اُن کے اتباع کا دلی جذبہ بھی پیدا کیا جاتا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ پاکستان کے قیام کی شکل میں سیاسی انقلاب رونما ہو چکا ہے۔ اب یہ سوال چھیڑنا بالکل بے کار ہے کہ معاشرتی انقلاب پہلے برپا کرنا چاہیے اور سیاسی انقلاب بعد میں۔ اب تو سوال یہ پیدا ہو گیا ہے کہ جب تک قوم میں ذہنی انقلاب واقع نہ ہو اُس وقت تک آیا ہم سیاسی اختیارات کو کافرانہ اصولوں کے مطابق استعمال کرتے رہیں یا ان اختیارات کو بھی اسلامی اصولوں کے مطابق کام میں لائیں۔ سیاسی اقتدار کا کوئی نہ کوئی مصرف اور مقصد بہر حال ہمیں متعین کرنا پڑے گا۔ حکومت کی مشینری کو اخلاقی انقلاب رونما ہونے تک معطل بہر حال نہیں کیا جا سکتا۔ ایک قوم جو خدا اور اس کے رسُول کی حاکمیت اور بالادستی پر ایمان رکھتی ہو، اجتماعی اور قومی زندگی کی باگیں اُس کے اپنے ہاتھ میں ہوں، اپنا نظامِ حیات وہ خود تعمیر کرنے کے قابل ہو اور کوئی دوسری کافرانہ طاقت اُس پر کوئی کافرانہ نظام مسلط کرنے والی نہ ہو تو کیا اس قوم کے افراد کے لیے یہ جائز اور درست ہو سکتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو اخلاقی وعظ و نصیحت تو کرتے رہیں مگر اپنی ہیئت حاکمہ کو غیر اسلامی اصولوں کے مطابق کام کرنے کے لیے چھوڑ دیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم اس صورت حال کو گوارا کر لیں تو گو ہم انفرادی ارتداد کے مرتکب نہ ہوں، اجتماعی اور قومی حیثیت سے ہم ضرور ارتداد کے مرتکب ہوں گے۔

پھر اس معاملے کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر آپ اجتماعی و اخلاقی انقلاب لانا چاہتے ہیں تو آپ کو غور کرنا پڑے گا کہ اس انقلاب کے ذرائع و وسائل کیا کیا ہو سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان ذرائع میں تعلیم و تربیت، معاشرتی اصلاح، ذہنی اصلاح اور اسی قسم کی بہت سی چیزیں شامل ہیں۔ انہی کے ساتھ حکومت کے قانونی اور سیاسی ذرائع و وسائل ہیں۔ حکومت کی طاقت نہ صرف بجائے خود

ایک بڑا ذریعہ اصلاح ہے، بلکہ وہ دیگر ساری اصلاحی تدابیر کو زیادہ مؤثر، نتیجہ خیز اور ہمہ گیر بنانے کا بھی ذریعہ ہے۔ اب آخر کیا وجہ ہے کہ اخلاقی انقلاب لانے کے لیے حکومت کے وسائل کو بھی استعمال نہ کیا جائے۔ ہمارے ووٹوں اور ہمارے ادا کردہ ٹیکسوں اور مالیوں کے بل پر ہی تو حکومت کا سارا نظام چل رہا ہے۔ آخر اس حماقت اور جہالت کا ارتکاب ہم کیوں کریں کہ ایک طرف انفرادی حیثیت سے ہم اسلام کے سماجی انقلاب کی راہ ہموار کرنے کی کوشش کریں اور دوسری طرف قومی حیثیت میں ہم کفر و الحاد کی اشاعت کریں۔ ایک طرف ہم اخلاقی اصلاح کی کوشش کرتے رہیں اور دوسری طرف حکومت کے سارے ذرائع اخلاق کے بگاڑنے اور فسق و فجور پھیلانے میں لگے رہیں۔

سوال۔ اسلام میں چوری کی سزا ہاتھ کا کاٹ دینا ہے۔ آجکل روزانہ سینکڑوں چوریاں ہوتی ہیں۔ تو کیا روزانہ سینکڑوں ہاتھ کاٹے جائیں گے؟

جواب ۔ قطع ید اور اسلام کے دوسرے قوانین فوجداری کے بارے میں اگر میں اسلام کا نقطۂ نظر پوری وضاحت سے بیان کروں تو اس میں بڑا وقت لگے گا۔ میں اس موضوع پر اپنی کتاب "اسلامی قوانین اور پاکستان میں اس کے نفاذ کی عملی تدابیر" میں تفصیلی بحث کر چکا ہوں۔ اس وقت میں صرف اتنی بات کہوں گا کہ اگر چور کے ہاتھ کاٹنے کا طریقہ آج ہی سے جاری کر دیا جائے تو انشاء اللہ چوری نہایت تھوڑے عرصے میں ختم ہو جائے گی اور سینکڑوں ہاتھوں کے کٹنے کی نوبت نہیں آئے گی۔ ایک چور یہ امید رکھتا ہے کہ میں دس ہزار چرا لوں گا اور اگر پکڑا جاؤں گا تو کچھ مدت تک سرکاری روٹیاں کھا کر واپس آجاؤں گا اور اس وقت بھی میرے پاس اچھا خاصا سرمایہ جمع ہو گا۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص دوبارہ اولین موقع پاتے ہی پھر چوری کرے گا۔ اس طرح کے عادی مجرمین کی ہمارے ہاں کثرت ہے اور انہی کو جرائم سے باز رکھنا مشکل ترین مسئلہ ہے۔ لیکن اگر چور کو یہ معلوم ہو کہ ایک مرتبہ پکڑے جانے کے بعد ایک ہاتھ اور دوسری مرتبہ پکڑے جانے کے بعد دوسرا ہاتھ کٹ جائے گا تو وہ چوری کرنے پر بآسانی آمادہ نہ ہو گا۔ پھر جس چور کا ہاتھ ایک مرتبہ کٹ جائے گا وہ جہاں جائے گا اُس کا کٹا ہوا ہاتھ پکار پکار کر داستان حال بیان کرے گا اور موجودہ صورت حال باقی نہیں رہے گی جس میں کہ پیشہ ور چور اور ڈاکو مہذب انسانوں کے بھیس میں چاروں سو اپنے شکار کی تلاش

کرتے پھرتے ہیں اور کوئی انہیں پہچان بھی نہیں سکتا۔ میری قطعی رائے یہ ہے کہ موجودہ وقت میں چوری کے انسداد کے لیے اس قانون کے نفاذ کی شدید ضرورت ہے۔ تہذیب جدید کے بہت سے نقائص میں سے ایک نقص یہ بھی ہے کہ اس کی ساری ہمدردیاں مجرم کے ساتھ ہیں، اُس سوسائٹی کے ساتھ نہیں ہیں جس کے خلاف مجرم سرگرم کار ہے۔ مجرد یہ سننے پر کہ چور کا ہاتھ کاٹا جائے گا اس تہذیب کے فرزندوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں لیکن ہولناک جرائم کو معاشرے میں پروان چڑھتے دیکھ کر وہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ آخر میں میں یہ بھی عرض کروں گا کہ اسلام صرف چور کا ہاتھ ہی نہیں کاٹتا، بلکہ وہ زکوٰۃ و صدقات کا نظام بھی قائم کرتا ہے، ہر شخص کی بنیادی ضروریات بھی پوری کرتا ہے، وہ شہریوں کی اخلاقی تعلیم و تربیت کا بھی انتظام کرتا ہے، وہ لوگوں کو حلال اور جائز طریق پر کمانا اور خرچ کرنا بھی سکھاتا ہے۔ اس کے بعد اگر ایک شخص کی حلال کمائی کو کوئی دوسرا حرام طریقے سے چراتا ہے تو اُسے ہاتھ کاٹنے کی سزا دی جاتی ہے۔

زکوٰۃ سے متعلق چند تصریحات

سوال۔ جماعت اسلامی کے بیت المال کی وساطت سے جس طرح زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم ہوتی ہے اس پر بعض اوقات دو اعتراض وارد کیے جاتے ہیں۔ پہلا اعتراض یہ ہے کہ زکوٰۃ کی رقوم جماعتی کاموں پر خرچ کر دی جاتی ہیں اور صاحب نصاب کارکنوں کو معاوضے اور تنخواہیں وغیرہ بھی اس مد میں سے دے دی جاتی ہیں، حالانکہ یہ زکوٰۃ کا کوئی صحیح مصرف نہیں ہے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ زکوٰۃ کی صحیح ادائیگی کے لیے تملیک لازمی شرط ہے۔ یعنی جب تک زکوٰۃ دینے والا کسی مستحق شخص یا اشخاص کو زکوٰۃ کا کلیتہً مالک و متصرف نہ بنا دے اُس وقت تک صحیح معنوں میں زکوٰۃ ادا ہی نہیں ہوتی۔ چونکہ جماعت کے بیت المال میں زکوٰۃ دیتے وقت کسی متعین فرد کو زکوٰۃ نہیں دی جاتی، اس لیے یہ زکوٰۃ کی ادائیگی کی صحیح شکل نہیں ہے۔ بہتر ہوگا کہ ان اعتراضات کی حقیقت کو واضح کیا جائے کہ یہ صحیح ہیں یا غلط اور مسئلہ تملیک کے علاوہ اس امر کی بھی وضاحت کی جائے کہ جماعتی کاموں میں زکوٰۃ کی رقم خرچ کی جا سکتی ہے یا نہیں۔

جواب۔ زکوٰۃ کے مستحق ازروئے قرآن یہ ہیں: فقراء، مساکین، عاملین زکوٰۃ، مؤلفۃ القلوب، الرقاب (غلام، قیدی وغیرہ)، الغارمین (ناگہانی قرض یا خسارے کے زیربار)، فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں)، اور ابن السبیل (مسافر)۔ جماعت اسلامی کے بیت المال میں زکوٰۃ کی جو رقوم آتی ہیں ان میں سے فقراء، مساکین اور غارمین کی مد کے تحت عام غیر مستطیع مسلمانوں کو بھی زکوٰۃ دی جاتی ہے اور فی سبیل اللہ کی مد میں سے جماعت کے مختلف مصارف میں بھی زکوٰۃ خرچ کی جاتی ہے۔ "فی سبیل اللہ" سے مراد عام طور پر قتال فی سبیل اللہ مراد لیا جاتا ہے اور اس کا مصرف یہ بتایا جاتا ہے کہ جن مجاہدین کے سازوسامان کا باقاعدہ انتظام نہ ہو، انہیں سامانِ جہاد کی فراہمی کے لیے اس مد میں سے زکوٰۃ دی جانی چاہیے۔ لیکن قرآن مجید، احادیث و آثار اور اقوالِ ائمہ کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ فی سبیل اللہ کا مفہوم اتنا محدود اور مخصوص نہیں جتنا کہ عام طور پر سمجھا گیا ہے۔

قرآن مجید نے "فی سبیل اللہ" کی مد بیان کرتے وقت قتال کی قید نہیں لگائی، حالانکہ اس مفہوم کو بیان کرنے کے لیے دوسرے مقامات پر بالعموم جہاد فی سبیل اللہ، قتال فی سبیل اللہ وغیرہ کے الفاظ آئے ہیں۔ دوسری طرف قرآن مجید میں جہاں صرف فی سبیل اللہ کا لفظ آیا ہے وہاں اس کے معنی کو عام رکھا گیا ہے اور اسے مطلقاً جہاد یا قتال کے لیے استعمال نہیں کیا گیا۔ اسی طرح قتال کے علاوہ اطاعتِ الٰہی کے بہت سے ایسے کام ہیں جن کے ساتھ فی سبیل اللہ کی صفت لگائی گئی ہے۔ احادیث میں سے جس حدیث سے بالخصوص یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ فی سبیل اللہ سے مراد قتال فی سبیل اللہ ہے وہ ابوداؤد، احمد اور حاکم کی یہ حدیث ہے: لا تحل الصدقۃ لغنی الا لغاز فی سبیل اللہ او لعامل علیہا او لغارم ... الخ (صدقہ کسی غنی کے لیے جائز نہیں الا یہ کہ وہ اللہ کی راہ کا غازی ہو یا زکوٰۃ کے سلسلے میں کارکن ہو یا مقروض و غارم ہو)۔ اس حدیث سے بلاشبہ یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ غازی غنی کو زکوٰۃ دینا جائز ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ فی سبیل اللہ کی مد سے صرف مجاہدین بالسیف ہی حصہ پا سکتے ہیں بعض دوسری احادیث ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مد میں سے حاجیوں کو زکوٰۃ کے اونٹوں سے استفادے کی اجازت دی ہے، چنانچہ اسی بنا پر فقہائے حنفیہ میں سے امام محمدؒ، امام ابویوسفؒ اور حسنؒ

فی سبیل اللہ کی مد سے حاجیوں کے زاد و راحلہ کا انتظام جائز قرار دیتے ہیں۔ بلکہ کتاب الخراج کی ایک عبارت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام ابو یوسف نے اس مد کا مصرف "اصلاح طرق مسلمین (سڑکوں کی مرمت) قرار دے کر اسے وسیع تر کر دیا ہے۔ اس مسلک کی تائید ایک صحابی کے قول سے بھی ہوتی ہے جو کتاب الاموال لابی عبید کے ص۵۷۲ پر منقول ہے اور وہ یہ ہے "عن انس بن مالك والحسن قالا ما اعطيت في الجسور و الطرق فهي صدقة ماضية وقال اسماعيل انها تجزى من الزكوٰة" (انسؓ بن مالک اور حسنؒ نے فرمایا کہ جو کچھ تو پلوں اور سڑکوں کے لیے دے وہ بھی صدقہ ہے اور اسماعیل نے اس کی تشریح میں فرمایا کہ اس طرح زکوٰۃ ادا ہو جائے گی"۔ شامی جلد ۲ ص۲۵ میں طلبہ کو بھی "فی سبیل اللہ" میں شمار کیا گیا ہے، خواہ وہ صاحب نصاب ہوں۔ علامہ آلوسی حنفی اپنی تفسیر روح المعانی میں "فی سبیل اللہ" کی تفسیر میں حنفیہ کا مسلک نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں "قيل المراد طلبة العلم واقتصر عليه في الفتاوى الظهيرية وفسره في البدائع بجميع القرب فيدخل فيه كل من سعى في طاعة الله تعالىٰ وسبل الخيرات" (اس سے طالب علم بھی مراد لیے گئے ہیں۔ فتاویٰ ظہیریہ میں اس مد کو طلبہ تک ہی محدود کیا گیا ہے لیکن البدائع والصنائع میں اس کی تفسیر یہ کی گئی ہے کہ اس میں اللہ سے قریب لانے والے سارے کام شامل ہیں۔ چنانچہ جو کوئی اللہ کی اطاعت اور بھلائی کے رستے میں دوڑ دھوپ کرے گا وہ اس میں داخل ہے"۔

احناف کے علاوہ دیگر مذاہب بھی اس مد کو مقاتلین تک محدود نہیں رکھتے بلکہ اس میں وسعت کے قائل ہیں۔ چنانچہ ابن عربی مالکی "احکام القرآن" میں فی سبیل اللہ کی تعریف میں لکھتے ہیں "قال مالك سبل الله كثير- احمد واسحاق قالا انه الحج والذى يصح عندى من قولهما ان الحج من جملة السبيل مع الغزو"۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ سبل اللہ یعنی اللہ کے راستے بہت سے ہیں۔ احمد اور اسحاق نے فرمایا ہے کہ فی سبیل اللہ سے مراد حج ہے لیکن میرے نزدیک ان کے قول کا صحیح مطلب یہ ہے کہ حج بھی جہاد کی طرح اللہ کے راستوں میں سے ایک راستہ ہے)۔

دیار ہند و پاکستان کے متعدد علماء نے بھی یہ تصریح کی ہے کہ فی سبیل اللہ سے مراد دین کے تحت ساری علمی و عملی سرگرمیاں ہیں۔ چنانچہ سیرت النبی جلد ۵ میں مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم فرماتے ہیں

"اکثر فقہاء نے فی سبیل اللہ سے مراد صرف جہاد لیا ہے مگر یہ تحدید صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ اوپر آیت گزر چکی ہے لِلْفُقَرَاءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ یہاں فی سبیل اللہ سے مراد بالاتفاق جہاد نہیں بلکہ ہر نیکی اور دین کا کام مراد ہے" مولانا عبدالصمد رحمانی (امارت شرعیہ بہار) نے اپنی ایک تالیف "کتاب العشر والزکوٰۃ" کے نام سے لکھی ہے۔ اس میں انہوں نے بھی فی سبیل اللہ کی مد میں ایسے لوگوں کو شمار کیا ہے جو دین کے کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ جماعت اسلامی کے اہل علم کا مسلک اس بارے میں اس جواب سے ظاہر ہوتا ہے جو مولانا مودودی نے مولانا اصلاحی اور مولانا عبدالغفار حسن صاحب کے مشورے سے حکومت کے ایک سوالنامے کے جواب میں ترجمان میں دیا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ "فی سبیل اللہ سے مراد جہاد فی سبیل اللہ ہے خواہ وہ تلوار سے ہو یا قلم و زبان سے یا ہاتھ پاؤں کی دوڑ دھوپ اور محنت سے۔ سلف کے نزدیک اس کا مفہوم ان مساعی تک محدود ہے جو خدا کے دین کو قائم کرنے، اس کی اشاعت کرنے اور اسلامی ممالک کا دفاع کرنے کے لیے کی جائیں"۔

جماعت اسلامی کا مقصد وحید اقامت دین ہے اور جماعت پوری کوشش کرتی ہے کہ اس کے اور اس کے کارکنوں کی سرگرمیاں اسی مقصد کے لیے وقف رہیں۔ مخیر حضرات کا بھی یہ کام ہے کہ وہ اپنی جگہ پر اس امر کا اطمینان کرلیں کہ آیا اس جماعت کے متفرق اور متنوع مشاغل اقامت دین اور فی سبیل اللہ کی تعریف میں آتے ہیں یا نہیں۔ اگر انہیں یہ اطمینان حاصل ہو جائے تو وہ اپنی زکوٰۃ جماعت کے بیت المال میں جمع کرا سکتے ہیں اور اگر یہ اطمینان حاصل نہ ہو تو وہ مختار ہیں، جہاں چاہیں اپنی زکوٰۃ دیں۔

جو اعتراض تملیک کے سلسلے میں کیا جاتا ہے اُس کا جواب یہ ہے کہ ہمارے نزدیک شخصی تملیک ادائے زکوٰۃ کے لیے شرط لازم نہیں ہے۔ عموماً لِلْفُقَرَاءِ کے لام کو لام تملیک قرار دے کر اس سے وجوب تملیک کے حق میں استدلال کیا جاتا ہے، مگر کلام عرب میں حرف لام صرف انہی معنوں میں استعمال نہیں ہوتا، بلکہ یہ حرف کئی مرتبہ تملیک کے بجائے انتفاع کے معنی دیتا ہے مثلاً وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ (الآیہ)۔ پھر تملیک شخصی کی شرط کو اگر ضروری بھی سمجھا جائے تو یہ اُسی صورت میں ممکن العمل ہے

جبکہ مسلمانوں کی کوئی ایسی ہیئتِ حاکمہ یا ہیئتِ اجتماعیہ موجود نہ ہو جو ساری زکوٰۃ کو وصول کرتی ہو۔ لیکن ایک اسلامی حکومت کے بیت المال میں جب زکوٰۃ اپنی مطلوبہ اور مشروع شکل میں ادا کی جاتی ہے تو ایسی صورت میں شخصی تملیک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر اگر اجتماعی حیثیت میں زکوٰۃ کی وصولی کے بعد ایک اسلامی حکومت زکوٰۃ کو کسی ایسے اجتماعی مصرف میں لگا دے جس کا فائدہ بحیثیت مجموعی مستحقین کو پہنچے تو یہ بھی زکوٰۃ کی تقسیم کی ایک بالکل جائز شکل ہوگی۔ اسلامی حکومت کی عدم موجودگی میں اگر مسلمانوں کا کوئی دینی و ملی ادارہ اسی طرز پر زکوٰۃ کی اجتماعی تحصیل و تقسیم کا انتظام کرے تو شرعاً اس پر بھی کسی قسم کا اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ جماعت اسلامی کے علاوہ اور بھی بہت سی جماعتیں اور ادارے بھی اپنی ہر طرح کی ضروریات پر زکوٰۃ کی رقوم اسی طرح خرچ کرتے ہیں جس طرح جماعت اسلامی خرچ کرتی ہے۔ لیکن ان میں سے بعض کے نزدیک انفرادی تملیک شرط ہے۔ چنانچہ اس شرط کو پورا کرنے کے لیے زکوٰۃ آنے پر پہلے اُسے ادارے کے نادار افراد کے سپرد کیا جاتا ہے اور پھر فوراً اُن سے لے کر اجتماعی فنڈ میں شامل کر دیا جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ حیلہ ایک غیر ضروری اور خواہ مخواہ کا تکلف ہے اور اس میں تملیک کی صورت سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ لین دین پہلے سے طے شدہ اور بالکل نمائشی ہوتا ہے، دائمی اور حقیقی تملیک، ہرگز مقصود نہیں ہوتی۔

یہاں ایک اور بات کو بھی صاف کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ آپ کے سوالات سے گمان ہوتا ہے کہ آپ کے خیال میں زکوٰۃ ہر حالت میں اُسی کو دی جانی چاہیے جو صاحبِ نصاب نہ ہو۔ اگر آپ کا یہ خیال ہے تو یہ صحیح نہیں ہے۔ یہ قید فقیر و مسکین کے لیے تو ایک حد تک درست ہے لیکن دوسری مدات میں بھی اگر یہ شرط لازم ٹھہرا دی جائے تو پھر مزید چھ مدات کو الگ الگ رکھنے کے کوئی معنی باقی نہیں رہتے کیونکہ جو صاحبِ نصاب نہیں ہوگا وہ بہر حال فقراء و مساکین کے زمرے میں داخل ہو کر مستحقِ زکوٰۃ ہو ہی جائے گا۔ اس کے لیے کسی دوسری بنائے استحقاق کے ذکر کرنے یا ملحوظ رکھنے کی کوئی خاص ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اگر ایک آدمی کو ایک سے زائد وجوہ زکوٰۃ کا حقدار بنا دیں تو بلاشبہ اُس کا حق فائق ہوگا لیکن یہ امر تو احادیث سے بصراحت ثابت ہے کہ فقر و مسکنت کے علاوہ دوسری

مخصوص صفات جس شخص کو مستحق زکوٰۃ بناتی ہیں وہ شخص صاحب نصاب اور غنی ہونے کے باوجود زکوٰۃ لے سکتا ہے۔ اس سلسلے کی ایک حدیث اوپر نقل کی جا چکی ہے۔

آخر میں یہ امر بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ زکوٰۃ جماعت اسلامی کے بیت المال کا واحد ذریعۂ آمدنی نہیں ہے۔ جماعت کی آمد کے متعدد ذرائع ہیں، ان میں کتب و رسائل کی آمدنی بھی ہے۔ ارکان و متفقین کی خصوصی اعانتیں بھی ہیں اور عام اہل خیر کے عطیات بھی ہیں۔ اس لیے یہ خیال کرنا بالکل غلط ہے کہ جماعت کے بالمعاوضہ کارکن اپنی تنخواہیں زکوٰۃ سے لے رہے ہیں یا جماعت کے دوسرے سارے کام زکوٰۃ کے بل پر چل رہے ہیں۔ اب تو بفضلہ یہ صورت ہے کہ متعدد بڑے بڑے شہروں میں خیراتی شفا خانے قائم ہیں اور زکوٰۃ و صدقات زیادہ تر ان پر صرف ہو رہے ہیں۔ بیت المال میں اگر زکوٰۃ آتی ہے تو اس کا باقاعدہ حساب رکھا جاتا ہے اور اعانت فقراء و مساکین پر جو کچھ خرچ ہوتا ہے اس کا بھی الگ حساب رکھا جاتا ہے۔ جماعت کے دیگر مصارف اتنے زیادہ ہیں کہ زکوٰۃ کی بقیہ رقم اگر ان میں خرچ ہو، تب بھی وہ ان مصارف کا ایک معمولی جزو بنتی ہے، اس لیے اس امر کا کوئی خدشہ باقی نہیں رہتا کہ زکوٰۃ اپنے صحیح مصرف میں خرچ نہ ہو۔

منصب تجدید اور وحی و کشف

سوال۔ رسالہ ترجمان القرآن بابت ماہ جنوری و فروری ۱۹۵۱ء کے صفحہ ۲۲۶ پر ایک سوال کے جواب کے دوران میں تحریر فرمایا گیا ہے کہ:

"پچھلے زمانہ کے بعض بزرگوں نے بلاشبہ اپنے متعلق کشف و الہام کے طریقہ سے خبر دی ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے مجدّد ہیں۔ لیکن انہوں نے اس معنی میں کوئی دعویٰ نہیں کیا کہ ان کو مجدد تسلیم کرنا ضروری ہے اور جو ان کو نہ مانے وہ گمراہ ہے۔"

یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی، کیونکہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے تفہیمات الٰہیہ میں بڑے زور کے ساتھ یہ دعویٰ فرمایا ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے مطلع فرمایا ہے کہ تو اس زمانہ کا

امام ہے۔ چاہیے کہ لوگ تیری پیروی کو ذریعۂ نجات سمجھیں۔" شاہ صاحب کی کتاب "تفہیمات" کا اصل حوالہ مع ترجمہ درج ذیل ہے:-

قد من اللّٰہ سبحانہ علیّ وعلی اھل زمانی بان منحنی طریقا من السلوک ھی اقرب الطرق وھی مرکبۃ من خمس اقربات اعنی الایمان الحقیقی وقرب النوافل وقرب الوجوب وقرب الفرائض وقرب الملکوت وجعل ھذہ الطریقۃ غایۃ من ارادھا نالہ اللّٰہ تعالیٰ۔ فھمنی ربی جل جلالہ انّا جعلناک امام ھذہ الطریقۃ و اوصلناک ذروۃ سنامھا وسددنا طرق الوصول الی الحقیقۃ القراب کلّھا الیوم غیر طریقۃ واحدۃ و ھو محبّتک والانقیاد لک فالسماء لیس علی من عاداک بسماء ولیست الارض علیہ بارض فاھل المغرب واھل المشرق کلھم رعیّتک و انت سلطنھم علموا اولم یعلموا فان علموا فازوا وان جھلوا	اللہ تعالیٰ نے مجھ اور میرے زمانے کے لوگوں پر یہ احسان کیا کہ اس نے مجھے ایک ایسا طریقۂ سلوک عطا کیا ہے کہ جو سب طریقوں سے قریب تر ہے۔ اور اس میں پانچ قسم کے قرب کے ذریعے ہیں۔ یعنی ایک تو ایمان حقیقی کا، دوسرا قرب نوافل، تیسرا قرب وجوب، چوتھا قرب فرائض اور پانچواں قرب ملکوت۔ اور اس کو ایسا عمدہ غایت بنایا ہے کہ جو کوئی اس کا ارادہ کرے گا وہ مراد کو پہنچے گا۔ اور میرے رب نے مجھے مطلع فرمایا ہے کہ ہم نے تجھے اس طریقہ کا امام مقرر کیا ہے اور اس کی اعلیٰ بلندی پر پہنچایا ہے اور ہم نے آج کے روز سے باقی سب طریقوں کو حقیقت قرب تک پہنچنے سے مسدود کر دیا ہے بجز اس طریقے کے جو تجھے دیا گیا اور وہ ایک ہی طریقہ ہے جو کھلا رکھا گیا۔ لوگوں کو چاہیے کہ تجھ سے محبت کریں اور تیری فرمانبرداری کو ذریعۂ نجات سمجھیں۔ اور ایسے آسمانی برکات اس شخص پر نہیں ہونگی جو تیرے ساتھ عداوت اور بغض رکھے گا اور نہ وہ ارضی برکات کا مورد ہوگا اور مغرب اور

خائبوا ۔ مشرق کے لوگ تیری رعیت کر دیے گئے ہیں۔ اور تو (عسلِ مصفیٰ ۔ جلد اول ص ۷-۱۴۶) ان کا بادشاہ مقرر کیا گیا ہے، خواہ وہ لوگ تیری حقیقت سے واقف ہوں یا نہ ہوں ۔ اگر واقف ہونگے تو فائز المرام ہونگے اور اگر بے خبر رہیں گے تو خسارہ اور ٹوٹا پائیں گے ۔

کیا جناب شاہ صاحب کا یہ دعویٰ درست تھا یا نہیں؟ اگر ان کا دعویٰ درست تھا تو پھر "ترجمان" کی مذکورہ بالا عبارت درست نہیں ہے ۔

اس عبارت کے بعد "ترجمان" میں لکھا گیا ہے کہ :

"دعویٰ کرکے اس کے ماننے کی دعوت دینا اور اسے منوانے کی کوشش کرنا سرے سے کسی مجدد کا منصب ہی نہیں ۔"

نیز یہ کہ :-

"جو شخص یہ حرکت کرتا ہے وہ خود اپنے اس فعل ہی سے یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ فی الواقع مجدّد نہیں ۔"

ان ارشادات کی بنیاد قرآنِ کریم ہے یا احادیثِ نبویہ، یا اپنے اجتہاد کی بنا پر یہ فتویٰ دیا گیا ہے ؟

رسالہ مذکورہ کے اسی صفحہ پر فقرہ ۶ کے ماتحت لکھا گیا ہے کہ :-

"کشف و الہام وحی کی طرح کوئی یقینی چیز نہیں ۔ اس میں وہ کیفیت نہیں ہوتی کہ صاحبِ کشف و الہام کو آفتابِ روشن کی طرح یہ معلوم ہو کہ یہ کشف و الہام خدا تعالیٰ کی طرف سے ہو رہا ہے ۔"

اگر امتِ محمدیہ کے کاملین کے الہام و کشوف کی یہ حقیقت ہے تو پھر ان کے خیر امت ہونے کی حالت معلوم شد ۔ حالانکہ پہلی امتوں میں عورتیں وحیِ یقینی سے مشرف ہوتی رہی ہیں اور خدا کے ایسے بندے بھی ہوتے رہے ہیں کہ جن کے کشف و الہام کا یہ عالم تھا کہ ایک اولوالعزم نبی

کو بھی سوال کرکے ندامت اٹھانی پڑی۔

بگر سبحان اللہ! امت محمدیہ کے کاملین کے کشوف و الہام عجیب قسم کے تھے کہ ان کو خود بھی یقین نہ تھا کہ یہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہیں یا نہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ کو ان کو اس قسم کے الہامات وکشوف دکھانے کی ضرورت کیا پڑ گئی جن سے نہ کوئی دینی فائدہ منصور تھا اور نہ ہی صاحب کشف و الہام کے لیے وہ موجب ازدیاد ایمان۔ بلکہ اُلٹا موجب تردّد ہونے کے سبب ایک قسم کی مصیبت تھے۔

جواب۔ آپ کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے وحی و الہام کے مختلف مفہومات کو گڈمڈ کردیا ہے۔ ایک قسم کی وحی وہ ہے جسے وحی جبلّی یا طبیعی کہا جاسکتا ہے، جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ہر مخلوق کو اس کے کرنے کا کام سکھاتا ہے۔ یہ وحی انسانوں سے بڑھ کر جانوروں پر اور شاید ان سے بھی بڑھ کر نباتات وجمادات پر ہوتی ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جسے وحی جزئی کہا جاسکتا ہے، جس کے ذریعے کسی خاص موقع پر اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو امورِ زندگی میں سے کسی امر کے متعلق کوئی علم، یا کوئی ہدایت دیتا ہے یا کوئی تدبیر سُجھا دیتا ہے۔ یہ وحی آئے دن عام انسانوں پر ہوتی رہتی ہے۔ دنیا میں بڑی بڑی ایجادیں اسی وحی کی بدولت ہوتی ہیں۔ بڑے بڑے اہم علمی انکشافات اسی وحی کے ذریعے ہوئے ہیں۔ بڑے بڑے اہم تاریخی واقعات میں اسی وحی کی کارفرمائی نظر آتی ہے ـــ جبکہ کسی شخص کو کسی اہم موقع پر کوئی خاص تدبیر بلا غور و فکر اچانک سُوجھ گئی اور اُس نے تاریخ کی رفتار پر ایک فیصلہ کن اثر ڈال دیا۔ ایسی ہی وحی حضرت موسیٰ کی والدہ پر بھی ہوئی تھی۔ ان دونوں قسم کی وحیوں سے بالکل مختلف نوعیت کی وحی وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو حقائق غیبیہ پر مطلع فرماتا ہے اور اسے نظامِ زندگی کے متعلق ہدایت بخشتا ہے تاکہ وہ اس علم اور اس ہدایت کو عام انسانوں تک پہنچائے اور انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لائے۔ یہ وحی انبیاء کے لیے خاص ہے۔ قرآن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس نوعیت کا علم، خواہ اس کا نام القاء رکھیے، الہام رکھیے، کشف رکھیے، یا اصطلاحاً اسے وحی سے تعبیر کیجیے، انبیاء و رسل کے سوا کسی کو نہیں دیا جاتا۔ اور یہ علم صرف انبیاء ہی کو اس

طور پر دیا جاتا ہے کہ انہیں اس کے من جانب اللہ ہونے، اور شیطان کی دراندازی سے بالکل محفوظ ہونے اور خود اپنے ذاتی خیالات، تصورات اور خواہشات کی آلائشوں سے بھی پاک ہونے کا پورا یقین ہوتا ہے نیز یہی علم حجت شرعی ہے، اس کی پابندی ہر انسان پر فرض ہے اور اس کو دوسرے انسانوں تک پہنچانے اور اس پر ایمان کی دعوت سب بندگان خدا کو دینے پر انبیاء علیہم السلام مامور ہوتے ہیں۔ اور پھر یہی وہ حق ہے کہ جس پر ایمان لانا لازمۂ نجات اور جس سے روگردانی کرنا قطعی طور پر موجب خسران ہوتا ہے۔

انبیاء کے سوا دوسرے انسانوں کو اگر اس تیسری قسم کے علم کا کوئی جزو نصیب بھی ہوتا ہے تو وہ ایسے دھندلے اشارے کی حد تک ہوتا ہے جسے ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے وحی نبوت کی روشنی سے مدد لینا (یعنی کتاب و سنت پر پیش کر کے اس کی صحت و عدم صحت کو جانچنا اور بصورت صحت اس کا منشا متعین کرنا) ضروری ہے۔ جو شخص اپنے الہام کو ایک مستقل بالذات ذریعۂ ہدایت سمجھے اور وحی نبوت کی کسوٹی پر اس کو پرکھے بغیر اس پر خود عمل کرے اور دوسروں کو اس کی پیروی کی دعوت دے، اس کے ایسے طرز عمل کو از روئے شریعت کوئی سند جواز نہیں دی جا سکتی۔ قرآن میں اس حقیقت کو متعدد مقامات پر صاف صاف بیان کیا گیا ہے، خصوصاً سورۂ جن کی آخری آیات میں تو اسے بالکل ہی کھول کر فرما دیا گیا ہے کہ عٰلم الغیب فلا یظہر علٰی غیبہٖ احداً الا من ارتضٰی من رسولٍ فانہ یسلک من بین یدیہ و من خلفہٖ رصداً لیعلم ان قد ابلغوا رسٰلٰت ربہم و احاط بما لدیہم و احصٰی کل شیءٍ عدداً۔

اگر ہم غور کریں تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ امت کے صالح و مصلح آدمیوں کو نبی کا سا کشف و الہام نہ دینے اور اس سے کم تر ایک طرح کا تابعانہ کشف و الہام دینے میں کیا مصلحت ہے۔ پہلی چیز عطا نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہی چیز نبی اور امتی کے درمیان بنائے فرق ہے، اسے دور کیسے کیا جا سکتا ہے۔ اور دوسری چیز دینے کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ نبی کے بعد اس کے کام کو جاری رکھنے کی کوشش کریں وہ اس بات سے محتاج ہوتے ہیں کہ دین میں ان کو حکیمانہ بصیرت اور اقامت دین کی سعی میں ان کو صحیح رہنمائی اللہ کی طرف سے حاصل ہو۔ یہ چیز غیر شعوری طور پر تو ہر مخلص اور صحیح الفکر

خادمِ دین کو بخشی جاتی ہے۔ لیکن اگر کسی کو شعوری طور پر بھی دے دی جائے تو یہ اللہ کا انعام ہے۔

قرآن کی رُو سے یہ حیثیت صرف ایک نبی ہی کو حاصل ہوتی ہے کہ وہ امرِ تشریعی سے مامور من اللہ ہوتا ہے اور خلق کو یہ دعوت دینے کا مجاز ہوتا ہے کہ وہ اس پر ایمان لائیں اور اس کی اطاعت کریں حتیٰ کہ جو اس پر ایمان نہ لائے وہ خدا کو ماننے کے باوجود کافر ہوتا ہے۔ یہ حیثیت نبی کے سوا کسی کو بھی نظامِ دین میں حاصل نہیں ہے۔ اگر کوئی اس حیثیت کا مدعی ہو تو ثبوت اُسے پیش کرنا چاہیے۔ نہ کہ ہم اس کے دعویٰ کی نفی کا ثبوت پیش کریں۔ وہ بتائے کہ قرآن و حدیث میں کہاں نبی کے سوا کسی کا یہ منصب مقرر کیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے اُس منصب پر مامور کیے جانے کا دعوےٰ کرے اور اپنے اس دعوے کو ماننے کی لوگوں کو دعوت دے اور جو اس کا دعویٰ تسلیم نہ کرے وہ مجرّد اس بناء پر کافر اور جہنمی ہو کہ اُس نے مدعی کے اس دعوے کو تسلیم نہیں کیا؟

اگر کوئی شخص حدیث "من یجدد لھا دینھا" کا حوالہ دے، یا ان احادیث کو پیش کرے جو مہدی کی آمد کے متعلق ہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اِن میں کہیں بھی مجدد یا مہدی کے منصب کی وہ حیثیت بیان نہیں کی گئی ہے جس کا یہاں ذکر ہو رہا ہے۔ آخر ان میں کہاں یہ لکھا ہے کہ یہ لوگ اپنے مجدد اور مہدی ہونے کا دعویٰ کریں گے، اور جو ان کے دعوے کو مانے گا وہی مسلمان رہے گا، باقی سب کافر ہو جائیں گے؟

یہاں یہ بحث چھیڑنا بھی خارجِ مبحث ہے کہ جو شخص تجدید و احیاءِ دین اور اقامتِ دین کا برحق کام کر رہا ہو اس کا ساتھ نہ دینا یا اس کی مخالفت کرنا کس طرح موجبِ نجات ہو سکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس طرح کا کام جہاں اور جب بھی ہوتا ہے وہ فارق بین الحق والباطل بن جاتا ہے اور آدمی کے حق پرست ہونے کی پہچان یہی ہوتی ہے کہ وہ ایسے کام کا ساتھ دے۔ لیکن اس فرق و امتیاز کی بنیاد دراصل یہ ہوتی ہے کہ دین کی تجدید و اقامت میں سعی کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے نہ یہ کہ کسی مدعی کے دعوے کو ماننا ایمان کا تقاضا ہوتا ہے اور مجرد اس بنا پر ایک مسلمان نجات سے محروم ہو جاتا ہے کہ اس نے ایک شخص کے دعوائے مجددیت یا مہدویت کو نہیں مانا۔

اب شاہ ولی اللہ صاحب اور مجدد سرہندی رحمہا اللہ کے دعووں کو لیجیے۔ ان دونوں بزرگوں کے تجدیدی اور اصلاحی کارناموں کے اعتراف کے باوجود یہ کہے بغیر چارہ نہیں ہے کہ ان کا اپنے مجدد ہونے کی خود تصریح کرنا اور بار بار کشف و الہام کے حوالہ سے اپنی باتوں کو پیش کرنا اُن کے شایانِ شان نہ تھا۔ اُن کے اسی ادعا نے بعد کے بہت سے کم ظرفوں کو طرح طرح کے دعوے کرنے اور امت میں نت نئے فتنے اٹھانے کی جرأت دلائی۔ کوئی شخص اگر تجدید کے لیے کسی قسم کی خدمت انجام دینے کی توفیق پاتا ہو تو اسے چاہیے کہ خدمت انجام دے اور یہ فیصلہ اللہ پر چھوڑ دے کہ اس کا کیا مقام اس کے ہاں قرار پاتا ہے۔ آدمی کا اصل مقام وہ ہے جو آخرت میں اس کی نیت و عمل کو دیکھ کر اور اپنے فضل سے اس کو قبول کر کے اللہ تعالیٰ اسے دے، نہ کہ وہ جس کا وہ خود دعویٰ کرے یا لوگ اسے دیں۔ اپنے لیے خود القاب و خطابات تجویز کرنا اور دعووں کے ساتھ انہیں بیان کرنا اور اپنے مقامات کا ذکر زبان پر لانا کوئی اچھا کام نہیں ہے۔ بعد کے ادوار میں صوفیانہ ذوق نے تو اسے اتنا گوارا کیا کہ خوشگوار بنا دیا۔ حتیٰ کہ بڑے بڑے لوگوں کو بھی اس فعل میں کوئی قباحت محسوس نہ ہوئی، مگر صحابہ کرام اور تابعین و تبع تابعین و ائمہ مجتہدین کے دور میں یہ چیز بالکل ناپید نظر آتی ہے۔

ہم شاہ صاحب اور مجدد صاحب کے کام کی بے حد قدر کرتے ہیں، اور ہمارے دل میں ان کی عزت ان کے کسی معتقد سے کم نہیں ہے، مگر ان کے جن کاموں پر ہمیں کبھی شرحِ صدر حاصل نہیں ہوا ان میں سے ایک یہ ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے ان کی کسی بات کو بھی اس بنا پر کبھی نہیں مانا کہ وہ اسے کشف یا الہام کی بنا پر فرما رہے ہیں، بلکہ جو بات بھی مانی ہے اس وجہ سے مانی ہے کہ اس کی دلیل مضبوط ہے، یا بات بجائے خود معقول و منقول کے لحاظ سے درست معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح ہم نے جو اُن کو مجدد مانا ہے تو یہ ایک رائے ہے جو ان کا کام دیکھ کر ہم نے قائم کی ہے، نہ کہ ایک عقیدہ ہے جو ان کے دعووں کی بنا پر اختیار کر لیا گیا ہے۔

چند متفرق سوالات

سوال (۱) قرآن کریم میں "حق" کی اصطلاح کن کن معنی میں استعمال ہوتی ہے؟ اور وہ معنی ان مختلف آیات پر کس طرح چسپاں کیے جا سکتے ہیں جو تخلیق کائنات بالحق، کتاب بالحق، رسالت بالحق اور یحق الحق و یبطل الباطل کے تحت حق کی ہم آہنگی، تسلسل اور ارتقاء پر روشنی ڈالتے ہیں؟

(۲) قرآن کریم میں کتاب کے ساتھ میزان اتارنے کا جو دعویٰ کیا گیا ہے اس کا کیا مطلب ہے؟ الہامی قانون کے ساتھ وہ کونسی ترازو اتاری گئی ہے جس پر ہم اپنی سوسائٹی کے جواہر اور سنگریزوں کے وزن اور قیمت کا اندازہ کر سکیں۔ مفسرین کا یہ کہنا کہ انسانیت کے اخلاقی اعتدال کا نام میزان ہے، درست نہیں ہو سکتا۔ اول تو شخصی ضمیر کے اخلاقی احساسات سچائیوں کا صحیح وزن و قیمت متعین نہیں کر سکتے، دوسرے یہ کہ میزان کے ساتھ کتاب اتاری گئی ہے اور انسانی ضمیر کی میزان پیغمبروں اور کتابوں کے ساتھ نہیں اتاری جا سکتی وہ پہلے بھی تھی اور بعد کو بھی رہے گی۔

(۳) مذاہب کا پروگرام اگر انسانی فطرت کے لیے کشش رکھتا تھا تو متقی لوگوں نے کسی بھی ملک و قوم میں بہتر سوسائٹی بنانے میں کیوں کامیابی حاصل نہیں کی۔ اگر انسانیت کی پوری تاریخ میں بھی مذہب کامیاب نہ ہو سکا تو آج کیونکر اس سے امن و ترقی کی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں! یہ کہہ دینا کہ انسانی فطرت ہی میں خرابی مضمر تھی مفید نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اگر انسانی فطرت ہی اصلاح طلب نہ تھی تو پھر مذاہب حق کو زندہ کرنے اور باطل کو مٹانے کے لیے کام کرتے رہے مگر نتیجہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے علاوہ ہمیشہ الٹا ہی نکلا اور تاریخ کے سیلاب کا رخ یا بالفاظ دیگر شیطان کی طاقت شکست نہ کی جا سکی؟

(۴) پیغمبروں کی آمد کا سلسلہ کیوں بند ہو گیا؟ کیا انسانی شعور کو آج ان کی ضرورت باقی نہیں رہی؟

جواب: (۱) حق کا لفظ قرآن مجید میں تین معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ کہیں وہ حقیقت (REALITY) کے معنی میں آیا ہے، کہیں استحقاق (RIGHT) کے معنی میں اور کہیں مقصدیت (PURPOSIVENESS) کے معنی میں ہے۔

تخلیق کائنات کے سلسلہ میں جہاں کہیں یہ ارشاد ہوا ہے کہ ہم نے زمین و آسمان کو بالحق پیدا کیا ہے، اس سے مقصود ایک طرف تو یہ بتانا ہوتا ہے کہ یہ کائنات محض کھیل کے طور پر بے مقصد نہیں بنائی گئی ہے کہ کچھ مدت اس سے دل بہلا کر اسے یونہی بے نتیجہ ختم کر دیا جائے اور دوسری طرف یہ بتانا بھی پیش نظر ہوتا ہے کہ یہ کائنات اور اس کے ہنگامے بے حقیقت نہیں ہیں، جیسا کہ بعض فلسفیوں اور مذہبی گیانیوں کا تصور ہے، بلکہ یہ ایک سنجیدہ حقیقت ہے جس کے کسی پہلو کو محض کھیل نہیں سمجھنا چاہیے۔ نیز بعض مقامات پر اس ارشاد سے یہ بتانا بھی مقصود ہوتا ہے کہ یہ کائنات اور اس کا سارا نظام "حق" پر مبنی ہے جس میں باطل کے لیے کوئی ثبات اور وزن نہیں ہے۔

(۲) "میزان" سے مراد صرف وہ توازن ذہنی اور وہ جانچنے اور تولنے کی صلاحیت اور صحیح و غلط کا موازنہ کرنے کی قوت ہے جو صرف انبیاء علیہم السلام اور کتاب الٰہی اور طریقۂ انبیاء سے حکمت و ہدایت اخذ کرنے والوں میں پیدا ہوتی ہے۔ محض پیدائشی اعتدال فکر یا فلسفیانہ غور و خوض اور لادینی اخلاقی تعلیمات سے بظاہر جو توازن پیدا ہوتا ہے وہ حقیقی توازن نہیں ہوتا، بلکہ اس میں بہت افراط و تفریط باقی رہ جاتی ہے۔ یہ چیز صرف ان لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو آیاتِ الٰہی میں تدبر کرتے ہیں اور انبیاء علیہم السلام کی زندگیوں کا غائر مطالعہ کر کے ان سے علم کی روشنی اور حکیمانہ بصیرت حاصل کرتے ہیں۔

(۳) آپ کا یہ سوال جتنے مختصر لفظوں میں ہے، اتنے مختصر لفظوں میں اس کا جواب نہیں دیا جا سکتا، تاہم اگر محض اشارات سے آپ کی تشفی ہو سکے تو جواب یہ ہے کہ اوّل تو آپ لفظِ مذہب کے نام سے جس چیز کو مراد لیتے ہیں اس کا تعین کریں۔ اگر مذہب کا لفظ آپ جنس کے طور پر استعمال کر رہے ہیں جس میں ہر قسم کے مذاہب شامل ہیں تو اس کی طرف سے جواب دہی کرنا میرا کام نہیں ہے اور اگر مذہب سے آپ کی مراد دینِ حق، یعنی وہ دین ہے جس کی تعلیم ابتدائے آفرینش سے انسان کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی جاتی رہی ہے اور جس کا نام عربی زبان میں اسلام ہے تو وہ مجموعہ ہے ان اصولوں کا جو کائنات کی واقعی حقیقتوں پر مبنی ہیں اور بجائے

خود صحیح ہیں، خواہ انسان ان کو مانے یا نہ مانے۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسے مثلاً حفظانِ صحت کے اصول ہیں کہ وہ انسان کے جسم کی ساخت اور اس کے اعضاء کی حقیقی فعلیت اور اس کے طبعی ماحول کی واقعی حقیقتوں پر مبنی ہیں۔ ان اصولوں کے مطابق کھانا، پینا، سانس لینا، آرام کرنا وغیرہ لازمی طور پر انسان کو تندرست رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص یا ساری دنیا مل کر بھی ان اصولوں کی خلاف ورزی کریں تو نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ حفظانِ صحت کے اصول باطل ہیں، نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی پابندی کرنا انسانی فطرت کا تقاضا نہیں ہے، نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ اصول ٹوٹ گئے اور شکست کھا گئے اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسانوں کی اس خلاف ورزی نے ان اصولوں کا کوئی نقصان کیا ہے، بلکہ درحقیقت اگر انسان ان اصولوں کے خلاف چلتے ہیں تو یہ ان کی ناکامی ہے اور نقصان ان کا اپنا ہے، نہ کہ ان اصولوں کا۔ پس آپ جس چیز کو مذہب کی ناکامی کہہ رہے ہیں، وہ مذہب کی ناکامی نہیں، انسانوں کی ناکامی ہے۔ مثال کے طور پر مذہب ہم کو امانت کی تعلیم دیتا ہے، اب اگر تمام دنیا کے انسان مل کر بھی خیانت شروع کر دیں اور امانتوں کو ضائع کرنے لگیں تو کیا آپ یہ کہیں گے کہ مذہب ناکام ہو گیا؟ مذہب کی ناکامی تو اس صورت میں ہو سکتی ہے جبکہ یا تو یہ ثابت ہو جائے کہ فطرتِ کائنات اور فطرتِ انسان امانت کی نہیں، خیانت کی مقتضی ہے، یا یہ ثابت ہو جائے کہ انسانی زندگی کا حقیقی امن اور تمدنِ انسانی کا قابلِ اعتماد استقلال اور تہذیب کا تسلسل ارتقاء امانت سے نہیں، بلکہ خیانت سے قائم ہوتا ہے۔ لیکن اگر یہ ثابت نہیں ہوتا اور نہیں ہو سکتا تو انسانوں کا امانت چھوڑ کر خیانت کو اختیار کرنا اور اس سے اخلاقی، روحانی اور تمدنی نقصانات اٹھانا انسانوں کی ناکامی کا ثبوت ہے، نہ کہ "مذہب" یا دین کی ناکامی کا۔ اسی طرح اور جتنے اصول "دین" نے پیش کیے ہیں یا بالفاظِ دیگر جن اصولوں کے مجموعے کا نام "دینِ حق" ہے ان کو جانچ کر دیکھیے کہ وہ حق ہیں یا نہیں؟ اگر وہ حق ہیں تو ان کی کامیابی و ناکامی کا فیصلہ اس بنا پر نہ کیجیے کہ انسانوں نے ان کی پابندی کی ہے یا نہیں؟ انسانوں نے جب ان کی پیروی کی تو وہ خود کامیاب ہوئے اور اگر ان کی پیروی نہ کی تو وہ خود ناکام ہوئے۔

(۴) جو لوگ ختم نبوت کی یہ توجیہ کرتے ہیں کہ انسانی شعور کو اس کی ضرورت نہیں رہی تو وہ دراصل سلسلۂ نبوت کی توہین اور اس پر حملہ کرتے ہیں۔ اس تعبیر کے معنی یہ ہیں کہ صرف ایک خاص شعوری حالت تک ہی اس ہدایت کی ضرورت ہے جو نبی لاتے ہیں۔ اس کے بعد انسان نبوت کی رہنمائی سے بے نیاز ہو گیا ہے۔

جب تک انسانی تمدن اس حد پر نہیں پہنچا تھا کہ کسی نبی کا پیغام عام ہو سکے اور انسانوں کی کوئی ایسی امت تیار نہ ہو سکی تھی کہ نبی کے پیغام اور اس کی تعلیم اور اس کے اُسوہ کو محفوظ رکھ سکے اور دنیا کے گوشے گوشے میں اسے پھیلا سکے، اس وقت تک سلسلۂ نبوت جاری رہا اور مختلف قوموں اور ملکوں میں نبی بھیجے جاتے رہے، مگر جب ایک طرف تو تمدن اس حد تک ترقی کر گیا کہ ایک نبی کا پیغام عالمگیر ہو سکتا تھا اور دوسری طرف ہدایت حق قبول کرنے والوں کی ایک ایسی امت بھی بن گئی جو کتاب الٰہی کو اور کتاب کے لانے والے کی سیرت اور اس کی مکمل عملی رہنمائی کو جُوں کی توں محفوظ رکھنے کے قابل تھی تو نبوت کی خدمت پر کسی مزید آدمی کو مامور کرنے کی حاجت باقی نہ رہی۔

اسلامی نظام معیشت میں منصوبہ بندی

سوال: جماعت اسلامی کی تحریروں کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھے یہ یقین ہو گیا ہے کہ اسلام وسائل پیداوار کو قومی ملکیت بنانے کے خلاف ہے۔ اگر یہ درست ہے تو پھر مسابقت کے اس دور میں جب اشیاء نہایت ہی سرعت کے ساتھ پیدا کی جا رہی ہیں، قومی پیداوار کو ایک منصوبہ کے تحت ترقی دینے میں آپ کیا تدابیر اختیار کریں گے؟

جواب: آپ کا یہ سوال ایک طویل بحث کا متقاضی ہے۔ فی الحال صرف اسی قدر سمجھ لیجیے کہ منصوبہ بندی اور REGIMENTATION میں ایک نمایاں فرق ہے۔ اسلام جس چیز کا مخالف ہے وہ REGIMENTATION ہے، منصوبہ بندی نہیں۔

معلوم نہیں لوگوں نے یہ بات کیونکر فرض کر لی ہے کہ کوئی منصوبہ وسائل پیداوار کو حکومت کی

(باقی ص ۴۳۲ پر)

(بقیہ رسائل و مسائل)

تحویل میں دیے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ ملک کی پیداوار کو ایک منصوبہ کے تحت بڑھانے کے لیے اور بھی کئی طریقوں سے کام لیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ٹیکسوں، گاڑیوں کے کرایوں، اور درآمد و برآمد کی پالیسی کے ذریعہ لوگوں کی توجہ بعض چیزوں کی پیدائش سے ہٹا کر دوسری طرف لگائی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ پریس اور پراپیگنڈے سے بھی یہ کام لیا جا سکتا ہے۔

آپ کو اس سلسلہ میں جو غلط فہمی پیدا ہو رہی ہے وہ یہ ہے کہ آپ کے پیش نظر ایک ایسی قومی حکومت کا تصور ہے جس کے ہر شہری کے سامنے پیداوار بڑھانے اور نفع کمانے کے علاوہ کوئی دوسرا مقصد نہیں۔ اس لیے اس کی پیداوار کو ایک منصوبہ کے تحت ترقی دینے کی اشد ضرورت ہے۔ منصوبہ بندی کی افادیت سے مجھے انکار نہیں مگر جس خطرہ کے پیش نظر آپ اس سلسلہ میں مضطرب ہیں وہ خطرہ مجھے اسلامی ریاست میں نظر نہیں آتا۔ مغربی قوموں کو اس کی شدید ضرورت اس لیے پیش آئی کہ ان کے سامنے سوائے نفع اندوزی کے اور کوئی دوسرا مقصد نہ تھا۔ چنانچہ انہیں جس کام میں نفع کی سب سے زیادہ گنجائش نظر آئی، اُس کے پیچھے دیوانہ وار پڑ گئے۔ اگر انہوں نے یہ دیکھا کہ کپڑے سے زیادہ شراب میں نفع حاصل ہوتا ہے تو انہوں نے وہ کام چھوڑ کر یہ شروع کر دیا اور اس بات کی مطلق پروا نہ کی کہ اس سے قوم کو کس قدر نقصان پہنچتا ہے۔ اس وجہ سے یورپ میں آج کل منصوبہ بندی کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔

آپ خود اندازہ لگائیں کہ کیا اسلامی ریاست میں بھی یہی صورت حالات ہوگی۔

پھر اس معاملہ کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ ہر قوم منصوبہ بندی میں سب سے زیادہ اہمیت اپنے بنیادی مقصد کو دیتی ہے۔ اس کو ایک منصوبہ کے تحت ڈھالنے سے زندگی کے باقی شعبے از خود منظم اور منضبط ہو جاتے ہیں۔ اسلامی ریاست جب اپنے بنیادی مقصد معروف کے قیام، اور فسق و فجور کے استیصال کے لیے منصوبہ بنائے گی تو زندگی کے دوسرے شعبے خود بخود ایک تنظیم میں ڈھل جائیں گے۔